چرچا عام تھا، بلکہ یہ ایسا دور تھا، جس میں بادشاہوں نے الوہیت کا روپ دھار رکھا تھا۔ اور نمرود جو اس سرکشی میں اس حد تک بڑھ چکا تھا، حضرت ابراہیمؑ کو اس کی تفہیم کے لیے خصوصیت سے متوجہ ہونا پڑا۔ اس نے حضرت ابراہیمؑ سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی دہلیزِ اقتدار پر سر جھکائیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے انکار کیا تو اس نے وجہ پوچھی۔ آپ نے فرمایا۔ میرا سر تو عبودیت کے لیے صرف اس ذاتِ گرامی کے آگے جھکتا ہے جس کے قبضۂ قدرت میں زندگی، اور موت کا نظام ہے۔ اس پر اس نے دو قیدیوں کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ ان میں جو قاتل تھا اس کی جان بخشی کی اور جو سزاوارِ قتل نہیں تھا اس کی گردن اڑا دی، اور پھر حضرت ابراہیمؑ سے مخاطب ہو کر کہا۔ کیا میں زندگی اور موت پر اختیار نہیں رکھتا۔ اور اگر یہی شرطِ الوہیت ہے تو میں بھی خدا ہوں۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ اس جواب میں جو گھپلا پنہاں ہے نمرود ایسے زیرک بادشاہ نے اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اصل بات یہ ہے کہ صاحبانِ اقتدار عموماً اپنے قصرِ اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ایسی کج بحثی کو عمداً جائز رکھتے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ کاروبارِ حکومت و سیاست میں ہر طرح کی فریب دہی نہ صرف روا ہے بلکہ مستحسن اور ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے نمرود بجائے اس کے کہ حضرت ابراہیمؑ کی واضح، صاف اور دوٹوک دلیل کے سامنے سپر ڈال دیتا، بکمال خیرہ چشمی پکار اٹھتا ہے: اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ کہ کسی کو زندگی حق بخشنا یا مار ڈالنا تو میرے دائرۂ اختیار میں داخل ہے۔

تبلیغ و دعوت کا پیغمبرانہ انداز ملاحظہ ہو کہ حضرت ابراہیمؑ استدلال کی اس لغزش پر مطلق اعتراض نہیں کرتے کہ احیاء و اماتت سے مراد یہ کب ہے کہ تم اپنے اقتدار کا ناجائز فائدہ اٹھاؤ اور جس کو چاہو مار ڈالو اور جس کو چاہو از راہ غلط بخشی معاف کر دو۔ دلیل کا مقصد تو یہ تھا کہ تم غرور و پندار کے اندھیروں سے باہر نکل کر اس حقیقت پر غور کرو کہ یہ چند دنوں کی زندگی کیا حیثیت رکھتی ہے۔ زندگی کا راز کیا ہے؟ موت کس کو کہتے ہیں اور زندگی، اور موت کے اس مکمل نظام کو کس کی ادائے تخلیق نے پیدا کیا؟ یا وہ کون ذاتِ گرامی ہے جو انسانوں کو عدمِ محض کے جزیرہ سے نکال کر زندگی کی وادیوں میں نشاط آفرینی کے مواقع عطا کرتی ہے

اور وہ کون حقیقت ہے جو زندگی کی نشاط آفرینیوں کو چشم زدن میں موت و ہلاکت کے سپرد کر دینے پر قادر ہے۔

حضرت ابراہیم نمرود کے غور و تدبر کی خاطر ایک اور اسلوب اختیار کرتے ہیں اور اس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

میرے پروردگار نے تو دنیا کو حرارت بخشنے اور ضو و تابش سے بہرہ ور کرنے کے لیے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ آفتاب کو مشرق سے نکالے، تم اگر واقعی کائنات کے مالک ہو تو اس کو دوسری سمت یعنی مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔ ظاہر ہے دلیل کا یہ انداز ایسا تیکھا اور روشن تھا کہ اس میں اس کی من مانی تاویلیں نہیں چل سکتی تھیں۔ اس لیے نمرود کے لیے اظہار تحیر اور بے چارگی کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

تحیر و بے چارگی کا سبب حضرت ابراہیمؑ کی غیر معمولی ذہانت بھی ہو سکتی ہے، جس کی نمرود توقع نہیں رکھتا تھا۔ اور یہ امر بھی کہ ایک شخص بحث میں اس کی کج روی کو جانتے ہوئے بھی اشارتاً یا کنایتاً کسی طرح اس پر معترض نہیں ہوتا۔ حالانکہ ایک عام مناظر یا حریف کی ادنیٰ چوک اور غلطی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نہیں، اسے بحث و جدل اور مناظرہ میں مہارت و کمال سمجھا جاتا ہے کہ حریف پر بھرپور حملہ کیا جائے، اور اس کی تذلیل کی جائے اور بتایا جائے کہ تمہارے انداز استدلال میں صرف و نحو، زبان اور منطق کی کیا کیا غلطی اور جھول پایا جاتا ہے۔

اسلوب و طریق استدلال کا یہی وہ موڑ اور نقطۂ اختلاف ہے جہاں عام مناظر اور داعی الی الحق کی راہیں جدا اور الگ نظر آتی ہیں۔ جہاں مناظر کا نقطۂ نظر یہ ہوتا ہے کہ حریف پر غلبہ حاصل کرے اور اسے برسر عام ذلیل کرے، وہاں انبیا مخالف کی عزتِ نفس کو مجروح کیے بغیر یہ چاہتے ہیں کہ براہِ راست اس کے ذوق و شعور اور سمجھ بوجھ کی صلاحیتوں کو بیدار کیا جائے، اور پیار اور محبت سے ثابت کیا جائے کہ ان کی دعوت صحیح ہے اور سچائی کی اس منطق پر مبنی ہے جس کو ہر کوئی جانتا بوجھتا اور مانتا ہے۔